Fikr-o-Nasar (Islamabad) 16:1 (1978)

اسلام میں سیاسی آزادی کا تصور

(۱)

محمد نذیر کاکاخیل

نفس مضمون کے آغاز سے پہلے ضروری ہے کہ آزادی کا صحیح مفہوم واضح کر دیا جائے۔ یہ وضاحت دو وجوہ کی بنا پر ضروری ہے :۔

اول : متمدن سیاسی معاشرہ کے آغاز ہی سے انفرادی آزادی اور مملکتی اقتدار کے درمیان تعلق کا مسئلہ توجہ طلب رہا ہے۔ ایک طرف اگر سیاسی مفکرین کی بڑی تعداد نے انفرادی آزادی کو اہمیت دی ہے تو دوسری طرف مملکتی اقتدار کو اولیت دینے والوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں۔ در اصل جدید ''ازمز'' (IS MS) اسی موضوع بحث کی پیداوار ہیں۔

دوم : مشرقی ممالک، خصوصاً اسلامی دنیا میں اسلام و مغربیت کے درمیان کشمکش کی وجہ سے انفرادی آزادی اور مملکتی اقتدار کے درمیان تعلق کا مسئلہ اور بھی الجھ کر رہ گیا ہے۔

عام طور پر آزادی کا مطلب پابندیوں کا فقدان سمجھا جاتا ہے لیکن یہ ایک منفی انداز فکر ہے۔ سیاسیات کی اصطلاح میں آزادی کا مثبت پہلو یہ ہے کہ ایک شہری کی شخصیت کی ترقی کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کیا جائے تاکہ وہ آسانی کے ساتھ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر نہ صرف خود ایک متمدن سیاسی معاشرہ کی رکنیت سے مستفیدہو بلکہ اس معاشرہ کی تعمیر و ترقی میں بھی اپنا بھرپور کردار ادا کر سکے۔ چونکہ موضوع بحث سیاسی آزادی ہے لہذا پہلے اس کی وضاحت ضروری ہے۔

© Dr Muhammad Hamidullah Library, IIU, Islamabad. http://iri.iiu.edu.pk/

اس صدی کے مشہور و معروف مفکر ہیرالڈ۔ جے۔ لاسکی کے قول کے مطابق ’’ ریاست کے معاملات میں سرگرم عمل ہونے کے اختیار یا حق کو سیاسی آزادی کہتے ہیں۔،، گلکرائسٹ اورگسٹل کے نزدیک ’’سیاسی آزادی عملی طور پر جدید دور کی جمہوریت یا عوامی حکوست کی ہم معنی ہے۔،، جب کہ لیکاک کے مطابق ’’سیاسی آزادی شہریوں کا وہ حق ہے جو انہیں ارکان حکوست منتخب کرنے اور انہیں اپنے سامنے جوابدہ بنانے کے قابل بناتا ہے۔،،

مندرجہ بالا تعریفوں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ سیاسی آزادی شہریوں کو ملکی معاملات میں حصہ لینے کے قابل بناتی ہے تا کہ وہ آزادانہ طور پر یہ فیصلہ کر سکیں کہ مملکت کا اقتدار کس طرح کام میں لایا جائے، فلاح عامہ کے لئے کس قسم کی خارجہ و داخلہ پالیسیاں اختیار کی جائیں اور ان پالیسیوں کو کس قسم کی حکومت بطریق احسن سر انجام دے سکے گی۔ ظاہر ہے یہ مقاصد حق رائے دہی، حق عہدہ و منصب اور حق تنقید ہی کے ذریعے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مغربی استعمار سے آزادی حاصل کرنے کے بعد مسلم دنیا کے ممالک ترقی کی رفتار تیز کرنے اور ترقی یافتہ ممالک کے دوش بدوش چلنے کی خاطر مغربی علوم کے پرستار ہیں۔ جدید مغربی افکار بذات خود اتنے برے نہیں اور نہ ان کی تقلید اتنی قابل ملامت ہے۔ لیکن جو فضا ان سے مطابقت رکھتی ہے یا جو مخصوص حالات و عوامل ان کے پیچھے کار فرما ہیں، اگر انہیں نظر انداز کر دیا جائے اور ان افکار کو من و عن مختلف ماحول میں اپنانے کی کوشش کی جائے تو ایسا طرز عمل نہ صرف لا حاصل بلکہ خطرناک بھی ہوسکتا ہے۔

اس وقت مسلم دنیا میں اسلامی تعلیمات سے غفلت اور مغرب کی اندھا

دھند نقالی کی وجہ سے نہ صرف اخلاقی بحران ہے بلکہ سیاسی خلفشار بھی ہے۔ چنانچہ ایک طرف اگر جدید تعلیم یافتہ طبقہ آزادی کے مغربی تصور کو عملاً دیکھنا چاہتا ہے اور مملکتی اقتدار کے ہر اقدام کو آزادی کے منافی سمجھتا ہے تو دوسری طرف اسی طبقے کے لوگ جو ایوان اقتدار میں ہوتے ہیں، ایسے طرز عمل کو سیاسی میدان میں ایک رکاوٹ کی حیثیت دیتے ہیں۔ غالباً اسی کشمکش کے باعث ان ممالک میں آئے دن ہڑتالیں، سیاسی فسادات، ہنگامہ آرائیاں تخریب کاریاں، غیر آئینی ذرائع سے حکومتوں کا تختہ الٹنے کی سازشیں ہوتی رہتی ہیں۔ اس سیاسی عدم استحکام کے باعث اقتصادی ترقی بری طرح متاثر ہوتی رہتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر مغرب کے سیاسی افکار ہمارے مخصوص حالات سے مطابقت نہیں رکھتے اور ہمارے سیاسی بحران کا پیش خیمہ ہیں تو کیا ہمارے اپنے نظام فکر (اسلام) میں آزادی کا ایسا تصور موجود نہیں ہے جو ہمیں بیسویں صدی کے پیچیدہ معاشرہ میں آگے بڑھا سکے؟ اگر ہے تو اسلامی تاریخ کے کس حصے میں اس کا عملی نمونہ پیش کیا گیا ہے اور مثبت نتائج برآمد کئے جا چکے ہیں؟ ذیل کے صفحات میں اس قسم کے سوالوں کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

(۲)

مغرب کے سیاسی مفکرین انسانی فطرت سے بحث کرتے وقت انسان کو یا تو فرشتہ سیرت قرار دیتے ہیں یا پھر گناہوں کا پتلا۔ آزادی اور مملکت کے اقتدار کے درمیان تعلق کا مسئلہ جس کا اوپر حوالہ دیا جا چکا ہے، انھی مفروضوں کے گرد گھومتا ہے۔ لیکن اسلام ان دو انتہاوں کے بین بین چلتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

''ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا۔ پھر (رفتہ رفتہ) اس (کی حالت) کو (بدل کر) پست سے پست کر دیا۔ مگر جو لوگ ایمان لے آئے اور نیک عمل کرتے رہے ان کے لئے بے انتہا اجر ہے،،۔(۱)

پست اور بلند دونوں کے لئے خدا نے کائنات کو مسخر کیا اور انہیں دعوت فکر دی کہ وہ حق کی تلاش کریں۔(۲) اس کے ساتھ انہیں تنبیہ بھی کی کہ اگر کھلی نشانیاں دیکھنے کے باوجود انہوں نے باطل کا راستہ اختیار کیا تو اپنے طرز عمل کا پورا پورا حساب دینے کے لئے تیار رہیں۔(۳) اور یہی وہ بنیادی فرق ہے جو اسلامی نظام فکر کو دوسرے افکار سے ممیز کرتا ہے۔ اسلام آزادی کےساتھ ذمہ داری کے احساس اور جزا و سزا کے تصور کو مربوط رکھتا ہے۔ اقتدار اعلی کو اسلام میں اس لئے خدا کی مقدس امانت قرار دیا گیا ہے کہ اسے اس کی مخلوق کی بہتری کے لئے استعمال کیا جائے نہ کہ ان کی دل آزاری یا ذاتی جاہ و حشمت کے لئے۔ دوسرے لفظوں میں، اسلام زندگی کے ہر شعبے میں بہتر اور مؤثر نتائج پیدا کرنے کی غرض سے اخلاقی اقدار کو اولیت دیتا ہے۔ اس زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے تو اسلام میں سیاسی آزادی بھی خدا کی ایک امانت ہے جسے اس کی خوشنودی اور اس کی مخلوق کی بہتری کے لئے استعمال کرنا چاہئے۔

قرآن پاک ہر قوم کو اپنے حالات میں غور و فکر کرنے کی دعوت دیتا ہے اور بہتر تبدیلی پیدا کرنے کی ترغیب دیتا ہے (۴) بہتر تبدیلی پیدا کرنے کا مؤثر اور بہترین طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کو ملکی معاملات میں بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر باھمی اعتماد اور ذمہ داری کے جذبے کے تحت شریک کار بنایا جائے۔ انہیں قوم کی بہتری کی خاطر اظہار خیال کی آزادی ہو۔ وہ قابلیت اور اہلیت کی بنا پر عہدہ و منصب کا حق رکھتے ہوں اور انہیں تعمیری تنقید

کے ذریعہ صدائے حق بلند کرنے کی آزادی حاصل ہو۔ ہاں اگر عوامی بہبود کی آڑ میں تنقید کے ذریعہ ذاتی اغراض و مقاصد حاصل کرنے پیش نظر ہوں تو اسلامی ریاست میں اس قسم کی تنقید نہ صرف ممنوع ہے بلکہ فتنہ کے مترادف ہے جس کے لئے اسلام نے سخت سزا مقرر کر رکھی ہے۔

قرآن کریم کی وہ آیتیں جو باہمی مشاورت سے متعلق ہیں(۵) آزادی رائے، باہمی اعتماد، احساس ذمہ داری اور ریاستی معاملات میں شہریوں کی بھر پور شرکت کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ سورهٔ آل عمران کی آیت نمبر ۱۵۹ کی تشریح کے ضمن میں مفسرین کی اکثریت اسے حکم کا درجہ دیتی ہے (۶) لیکن علامہ طبری فرماتے ہیں کہ اس آیت میں رسول اکرمؐ کو مسلمانوں سے امور سلطنت میں مشورہ کرنے کو اس لئے کہا گیا ہے تاکہ آنے والی نسلیں اور حکومتیں آپ کی سنت پر عمل پیرا ہوں۔(۷) قرآن پاک اور سنت نبوی نے ایک ڈھانچہ مہیا کرکے شورائی نظام کی بنیاد رکھ دی اور تفصیلات، حالات کے مطابق آنے والی نسلوں پر چھوڑ دیں۔ جدید دور میں اسی پاکیزہ سنت پر عمل پیرا ہونے میں ہماری نجات ہے لیکن اس کے لئے جو شرائط ہیں انہیں پورا کرنا ضروری ہے۔ یعنی مشورہ لینے والے اور دینے والے دونوں فریق راست بازی، دیانت داری، باہمی اعتماد، تقویٰ اور خدمت خلق کے جذبے سے سر شار ہوں۔ قرآنی ارشادات اور سنت نبوی نے اسلامی ریاست میں جمہوری اور اخلاقی قدروں کی نشان دہی کرکے آمریت کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند کر دئے۔ رسول اکرمؐ کا قول ہے کہ :

''اگر تمہارے حکام نیک ہوں، متمول اشخاص فیاض ہوں، اور تمہارے

معاملات باہمی مشوروں سے طے ہوں، تو زمین کی سطح اس کے باطن کی بہ نسبت تمہارے لئے بہتر ہے۔''(۸)

رسول اللہ ص کی سیاسی زندگی کا سرسری مطالعہ بھی اس بات کی شہادت کے لئے کافی ہے کہ آپ نے شہری ریاست مدینہ میں روحانی انقلاب برپا کرنے اور لوگوں کے اخلاق درست کرنے کے بعد جس مثالی معاشرہ کی بنیاد رکھی اس میں عامۃ الناس کی صائب رائے کا احترام کرتے ہوئے جمہوری اقدار کو کو بھی فروغ دیا۔ اس ریاست کے شہری ملکی معاملات میں شرکت رنگ، نسل، زبان، علاقہ یا سماجی حیثیت کی بنا پر نہیں بلکہ تقویٰ اور پرہیز گاری اور ذہانت و قابلیت کی بنیاد پر کرتے تھے۔(۹) آپ نے بڑے واضح الفاظ میں فرمایا کہ ''المستشار مؤتمن'' (۱۰) یعنی جسے مشورہ یا دوسرے لفظوں میں حکومتی معاملات میں شریک کار بنایا جائے وہ قابل اعتماد ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت کے معاملات میں شرکت یا سیاسی آزادی کے لئے اسلام ذہانت، دیانت، باہمی اعتماد، ذمہ داری اور خوف خدا کو لازمی قرار دیتا ہے۔ اگر کسی معاشرے کے افراد ان خصوصیات سے عاری ہوں تو ان کے ہاں مشورہ بے معنی ہوگا اور بجائے بہتر نتائج پیدا کرنے کے انتشار، بدنظمی، افراتفری اور بحران کا موجب بنے گا۔

رسول کریم ص کی سنت پر عمل پیرا ہوتے ہوئے حضرت ابو بکر صدیق رض نے اپنے دور خلافت میں نہ صرف معاشرتی، معاشی اور سیاسی امور میں فراست رکھنے والوں کو اپنے پاس سے جدا ہونے نہ دیا(۱۱) بلکہ اکثر مواقع پر عام لوگوں کو بھی ملکی معاملات میں شرکت کے مواقع فراہم کئے۔ حضرت عمر فاروق کے عہد میں شورائی نظام اور بھی مستحکم ہو گیا۔ آپ کی مجلس شوری میں نہ صرف عمر رسیدہ اصحاب فراست تھے بلکہ نوجوان بھی تھے۔(۱۲) عام مجالس شوری جو اہم مواقع پر منعقد ہوا کرتیں وہ اس سے الگ تھیں۔ مقصد کہنے کا یہ ہے کہ اخلاقی تربیت کے بعد اسلام نے شہریوں کو مکمل

سیاسی آزادی دے دی۔ کسی صدائے حق کو اس وجہ سے نہیں دبایا گیا کہ وہ حکمران کے خلاف ہے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم منصب رسالت کے باعث شہری ریاست مدینہ کے سربراہ بھی تھے لیکن آپ کی رحلت کے بعد شہریوں کو اپنا حکمران خود انتخاب کرنے کا موقع ملا۔ چنانچہ خلفائے راشدین کے انتخاب میں مسلمانوں نے براہ راست یا بالواسطہ طور پر بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بیلٹ کے ذریعہ انتظامیہ یا مقننہ کے انتخاب کا دعوی تو صدر اسلام کی ریاست کے لئے قبل از وقت ہے لیکن ملکی معاملات میں عام لوگوں کی شرکت کا عملی نمونہ، جو جدید جمہوریت کی روح ہے، اسلام آغاز ہی سے پیش کر چکا ہے۔ حضرت ابو بکرؓ کا انتخاب ابتدائی طور پر ایک ایسےمجمع میں کیا گیا جہاں نہ صرف انصار کی مختلف برادریوں کے سرکردہ لیڈر موجود تھے بلکہ مہاجرین کے مختلف خاندانوں کی معتبر اور غیر متنازعہ شخصیتیں بھی موقع پر پہنچ گئی تھیں۔(۱۳) جو لوگ کسی وجہ سے موقع پر نہیں پہنچ سکے تھے انہیں بھی ان معتبر اور بزرگ ہستیوں پر مکمل بھروسہ تھا کہ وہ جو بھی قدم اٹھائیں گے اسلام کی بہتری اور مسلمانوں کے فائدے کے لئے اٹھائیں گے۔ پھر ان بزرگوں نے جو فیصلہ کیا اس کی توثیق اگلے دن مسجد نبوی میں کی گئی جب مسلمانوں نے جوق در جوق حضرت ابو بکر کے ہاتھ پر بیعت کی۔ کیا یہ ستم ظریفی نہ ہوگی کہ ہاتھ اٹھانے یا بیلٹ پیپر پر نشان لگانے کو تو جمہوریت کا نام دے کر اس کی پوجا کی جائے اور بیعت کو جس کے ساتھ حقوق و ذمہ داریاں پیوستہ ہیں، قصہ پارینہ سے زیادہ اہمیت نہ دی جائے۔

یہ صحیح ہے کہ حضرت ابو بکر نے اپنے دور خلافت کے آخری ایام میں چند اصحاب الرائے سے مشورہ کرنے کے بعد حضرت عمر کو اپنا

جانشین نامزد کرنے کی خواهش کا اظہار کیا۔ حضرت عمر کی شخصیت اور اس وقت عرب کے مخصوص حالات کے پیش نظر یہ ایک مستحسن رائے تھی لیکن پھر بھی یہ سوچتے ہوئے کہ کہیں ان کا یہ اقدام غلط فہمیاں اور بعد میں تلخیاں پیدا نہ کرے، آپ نے ایک جلسہ عام منعقد کیا اور اس مسئلہ کے تمام پہلوں پر روشنی ڈالنے کے بعد فرمایا:

"اگر تم چاھو تو مل بیٹھ کر اپنی پسند کا آدمی منتخب کرو۔ ھاں اگر تمہاری مرضی ہو کہ میں تمہاری طرف سے اس (جانشینی کے) معاملہ میں اپنی پسند کا اظہار کروں تو خدا کی قسم میں تمہاری بہترین خدمت سر انجام دینے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کروں گا۔(۱۴)

حضرت عثمان غنی کے انتخاب کا واقعہ ہماری تاریخ کا ایک اہم باب ہے(۱۵) تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں لیکن اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ ان کا انتخاب محض انتخابی بورڈ (جو ابن عمر سمیت سات افراد پر مشتمل تھا) کی پسند کا مرھون منت نہیں اور نہ حضرت عبدالرحمن بن عوف کا اسمیں کوئی بڑا عمل دخل ہے۔ دراصل موخرالذکر نے حضرت عثمان کی خلافت کا اعلان اس وقت کیا جب انہوں نے نہ صرف خلافت کے امیدواروں کے انٹرویوز لئے بلکہ گلی گلی، کوچے کوچے، ھر دروازے پر دستک دی، شہر سے باھر آنے والوں سے ملے، فوج کے امراء سے ملاقاتیں کیں، اور یہ معلوم کیا کہ لوگ کسے چاھتے ھیں، تب وہ ایک نتیجے پر پہنچے۔(۱۶)

جہاں تک حضرت علی المرتضیٰ کے انتخاب کا تعلق ہے، بے شک وہ تاریخ اسلام کے بڑے نازک مرحلے پر ھوا۔ لیکن انھوں نے بھی شورشیوں کے دباؤ میں آکر نہیں بلکہ مہاجرین اور انصار کی اکثریت کے فیصلہ کی روشنی

میں خلافت کی ذمہ داری قبول کرنے پر مشکل سے آمادگی کا اظہار کیا ۔(۱۷) شورشیوں کے ایک نمائندہ گروہ سے تو آپ نے صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ :۔

"(خلیفہ کا چناؤ) تمہارا کام نہیں ۔ شہر میں اہل شوری اور اہل بدر موجود ہیں وہ جسے چن لیں گے وہی (قانونی) حکمران ہوگا ۔(۱۸)"

توجہ طلب امر یہ ہے کہ خلفائے راشدین کے چناؤ کے سلسلے میں مسلمانوں میں وقتی طور پر اختلاف بھی پیدا ہوئے، اپنے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کے سلسلے میں دلائل بھی پیش کئے گئے، وقتی طور پر گروہ بندیاں بھی ہوئیں ۔ ظاہر ہے جہاں سیاسی مسائل پر آزادانہ گفتگو ہو وہاں اس قسم کی عارضی تلخیوں کا پیدا ہونا قدرتی امر ہے لیکن یہ سب کچھ مسلمانوں یا ان کے زعماء نے ذاتی جاہ و حشمت یا گروہی مفاد کے لئے نہیں بلکہ نوزائیدہ ریاست میں اقدار کی نشو و نما اور اسلام کے پیغام کو مزید پھیلانے کے لئے کیا ۔ ان مواقع پر کسی بھی فریق نے مد مقابل کی ذات پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش نہیں کی ۔ اور نہ سیاسی اختلاف کو ذاتی وقار کا مسئلہ بنایا ۔ انہوں نے اختلافات بھی اخلاقی حدود کے اندر کئے ۔ وجہ یہ تھی کہ اس وقت سیاست مذہب کے تابع تھی نہ کہ مذہب سیاست کے ۔ پھر جب ایک امیدوار پر نظر انتخاب پڑی تو تمام اختلافات ختم ہو گئے ۔ سب اس کے جھنڈے تلے ملک و ملت کی بہتری کے لئے اپنی اپنی جگہوں پر کام کرنے کے لئے وقف ہو گئے ۔ صحابہ کرام کا یہ طرز عمل ہمارے لئے مشعل راہ ہے جسے اپنا کر ہی ہم جدید معاشرے کو ہر قسم کے بحران سے نجات دلانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں ۔

خلفائے راشدین کے دور پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ انہوں نے تعمیری تنقید کی حوصلہ افزائی کی ۔ حضرت ابوبکرؓ کا پہلا خطبہ اس سلسلے میں بنیادی اہمیت کا حامل ہے ۔ آپ کا یہ فرمانا بہت

بڑے معنی رکھتا ہے کہ :

''اے مسلمانو! تم نے مجھے اپنا سربراہ چن لیا ہے . . . اگر میں اچھے کام کروں تو میری اعانت کرنا ۔ اگر غلط کام کروں تو درست کر دینا ۔ جب تک میں خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کروں، تم میری اطاعت کرو اگر نافرمانی کروں تو میری اطاعت تم پر واجب نہیں ۔ ''(۱۹)

اس خطبے سے جہاں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اقتدار اعلی ایک مقدس امانت ہے جسے شہری شرعی حدود کے اندر استعمال کرتے ہوئے آزادی سے پوری طرح متمتع ہوتے ہیں، وہاں اس امر کا ثبوت بھی فراہم ہوتا ہے کہ سربراہ مملکت کے طرز عمل کی نگرانی اور تعمیری تنقید کے ذریعہ اسے صحیح کام کرنے پر آمادہ کرنا بھی مسلمانوں کا فریضہ ہے ۔ علاوہ ازیں اس خطبہ سے اس نکتہ کی بھی وضاحت ہوتی ہے کہ جب تک حکمران آئین (قرآن و سنت) کی پیروی کریں، مسلمان ان کی اعانت میں کسی قسم کا پس و پیش نہ کریں ۔ البتہ اگر حاکم آئین کی خلاف ورزی کرے تو دستوری ڈھانچے کے اندر اسے درست کرنے یا منصب سے ہٹنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے ۔ (۲۰) حضرت ابوبکرؓ کے بعض نکات کی وضاحت ہمیں حضرت معاذ بن جبل کی اس تقریر کے بعض حصوں میں بھی ملتی ہے جو انھوں نے شام کے حکمران کے دربار میں حضرت عمر کے ایلچی کی حیثیت سے کی تھی ۔ آپ نے فرمایا :

''ہمارا حکمران ہم ہی میں سے ہے ۔ اگر وہ ہمارے درمیان اللہ کی کتاب، پیغمبر کی سنت پر عمل کرے گا، ہم اسے حکمران کی حیثیت سے تسلیم کرتے رہیں گے لیکن اگر وہ ایسا نہ کرے تو ہم اسے معزول کر دیں گے ۔''(۲۱)

لیکن یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ جس طرح اسلام عام مسلمانوں کو اپنے حکمران کے طرز عمل پر نگرانی اور تعمیری تنقید کا حق دیتا ہے اسی طرح حکمران پر بھی یہ فرض عائد کرتا ہے کہ عام لوگوں پر نگاہ رکھے کہ کسی کے طرز عمل سے اسلامی ریاست کی سالمیت خطرے میں نہ پڑجائے۔

حضرت عمر کے عہد میں جمہوری اقدار اور اداروں نے جو نشوونما پائی، تاریخ میں اس کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔ سیاسی استحکام اور وحدت فکر کی خاطر آپ باہمی مشاورت کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔(۲۲) تعمیری تنقید کو حاکم اور رعایا دونوں کے لئے فائدے کا موجب گردانتے تھے(۲۳) حج اور دوسرے مواقع پر کھلے عام لوگوں کی شکایات سننا اور انہیں رفع کرنا آپ کا معمول تھا۔(۲۴) صرف یہی نہیں بلکہ اکثر صوبوں کے گورنر آپ نے متعلقہ صوبوں کے عوام کی مرضی کے مطابق مقرر کئے۔ اس عہد میں سیاسی آزادی کا اس سے زیادہ اور کیا تصور کیا جا سکتا ہے۔ جب تک مسلمانوں کو یہ حق حاصل رہا، ایک جمہوری عمل کے ذریعہ سیاسی ارتقاء جاری رہا لیکن جونہی سیاسی آزادی مفقود ہوئی، مملکت کا سیاسی ڈھانچہ ہی بدل گیا۔

(۳)

اوپر کے صفحات میں آزادی اور ذمہ داری میں ہم آہنگی کے تصور سے قرآن، سنت اور اسلامی تاریخ کی روشنی میں بحث کی گئی۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اسلام میں سیاسی آزادی کا اپنا ایک تصور ہے جو اس کے اخلاقی نظام کی پیداوار ہے۔ یہ آزادی بے لگام نہیں بلکہ ذمہ داری کے احساس سے پیوستہ ہے۔ جسے ذاتی جاہ و حشمت یا اغراض و مقاصد کے لئے نہیں بلکہ کائنات کے خالق کی خوشنودی اور اس کی مخلوق کی بہتری کے لئے طلب اور عطا کیا جاتا ہے۔ اس کے پیچھے فلسفہ یہ کارفرما ہے کہ ایک طرف عام لوگ

ملکی معاملات میں ذمہ داری کے ساتھ شرکت کرکے نہ صرف اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کر سکیں بلکہ ملک و ملت کی ترقی میں بھی بھر پور کردار ادا کر سکیں، تو دوسری طرف حکمران بھی مسلسل تعمیری تنقید کے ذریعہ اپنے آپ کو درست کرتے رہیں اور رائے عامہ سے باخبر رہ کر کوئی ایسا قدم نہ اٹھائیں جو عام بے چینی یا اضطراب کا باعث بن سکے۔ لہذا سیاسی آزادی کے ذریعہ ایک طرف اگر عوام اپنا اور حکومت کا احتساب کرتے ہیں تو دوسری طرف حکومت بھی اپنا اور عوام کا برابر محاسبہ کرتی رہتی ہے۔ اس طرح ایک متوازی جمہوری عمل جاری رہتا ہے جس سے ریاست کی جڑیں مضبوط ہوتی رہتی ہیں۔

دور حاضر میں اس قسم کی آزادی اسی وقت بار آور ثابت ہو سکتی ہے جب روحانی انقلاب برپا کرکے صحیح اسلامی خطوط پر ایک ترقی یافتہ معاشرہ قائم کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے فوری قانونی کارروائی کے ساتھ ساتھ تعلیمی اداروں میں اور ابلاغ عامہ کے ذرائع سے اسلامی تعلیمات کو خلوص نیت سے مقبول عام کرنا اور ان پر صدق دل سے عمل پیرا ہونا وقت کا اہم ترین تقاضا ہے۔

حواشی

۱ - قرآن کریم : ۹۵ : ۶۰۴

۲ - قرآن کریم : ۴۵ : ۱۲-۱۳، ۱۷ : ۷

۳ - قرآن کریم : ۱۷ : ۱۳-۱۴

۴ - قرآن کریم - ۱۳ : ۹۱

۵ - قرآن کریم - ۳ : ۱۵۹، ۴۲ : ۳۸

۶ - ابوبکر الجصاص : احکام القرآن جلد سوم قاهره ۱۳۴۷ھ، ص ۴۸-۴۹، الزمخشری : الکشاف، جلد اول بیروت ۱۹۴۷ء ص ۳۲۴، القرطبی : الجامع لاحکام القرآن جلد چهارم قاهره ۱۹۵۷ء ص ۲۴۹-

۷ - الطبری : جامع البیان عن تاویل آی القرآن (قاہرہ۔ تحقیق شاکر) جلد دوم ص ۳۴۵، ۳۴۶ -

۸ - الترمذی : الجامع (ابواب الفتن)

۹ - جنگ بدر کا نقشہ حباب بن منذر کے مشورے سے بدل دیا گیا (سیرت ابن ہشام جلد دوم ص ۲۷۲)، جنگ بدر کے اسیروں کی قسمت کا فیصلہ باہمی مشوروں سے ہوا جس کی توثیق قرآن کریم نے بھی کی (طبری تاریخ ص ۷ - ۱۳۵۵)۔ جنگ خدق کا نقشہ ایک آزاد کردہ غلام سلمان الفارسی کے مشورے پر بنایا گیا (سیرت ابن ہشام ص ۲۳۵ جلد سوم)

۱۰ - ابو داؤد : سنن (ابواب الآداب)

۱۱ - ابن سعد : الطبقات الکبرٰی جلد دوم بیروت ۱۹۵۷ ص ۳۵۰ -

۱۲ - بخاری (نور محمد اصح المطابع) کتاب الاعتصام۔

۱۳ - طبری۔ تاریخ ص ۱۸۴۱ و ما بعد۔

۱۴ - ابن قتیبہ : الامامۃ و السیاسۃ، قاہرہ ۱۹۶۸ ص ۱۹ -

۱۵ - بخاری بحولہ بالا ص ۵۲۴، ص ۱۰۷۲ -

۱۶ - بخاری ص ۱۰۶۹ - ۷۰، ابن کثیر البدایۃ و النہایۃ، جلد سات ص ۱۴۶ -

۱۷ - ابن سعد : طبقات جلد سوم ص ۳۱ -

۱۸ - ابن قتیبہ : الامامۃ ص ۴۶ -

۱۹ - الطبری ص ۱۸۲۹ -

۲۰ - یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ خلیفہ وقت نے اس موقع پر ایک آئینی نقطہ کی وضاحت کی۔ ممکن ہے اس کی ضرورت کبھی محسوس ہو ورنہ اسلامی ریاست میں ایسا شخص حکمراں نہیں بنایا جاسکتا جو ضعیف الاعتقاد ہو جس کا دامن داغدار ہو۔ ہاں اگر فرائض منصبی کے دوران اس میں تغیر پیدا ہو تو وہ حکمرانی کا حق کھو بیٹھتا ہے۔ اس آئینی نکتہ کی وضاحت کے لئے ملاحظہ ہو الماوردی :۔ الاحکام السلطانیہ ص ۱۷ -

۲۱ - الازدی : فتوح الشام (اردو ترجمہ ملیح آبادی) کلکتہ ۱۹۳۴ء ص ۱۵۸ -

۲۲ - باہمی مشاورت کی افادیت حضرت عمرؓ نے ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے :-

"ایک آدمی کی رائے اس کپڑے کی سی ہوتی ہے جو ایک (معمولی) دھاگے سے بنایا گیا ہو۔ دو کی رائے دوہرے دھاگے والے کپڑے کی اور تین کی رائے مضبوط دھاگوں سے بنے کپڑے کی ہوتی ہے جسے آسانی کے ساتھ نہیں پھاڑا جا سکتا۔"

ملاحظہ ہو ابن قتیبہ : عیون الاخبار، قاہرہ ۱۹۲۵ء جلد اول ص ۳۱ -

۲۳ - ابو یوسف : کتاب الخراج ص ۱۲ -

۲۴ - ابن سعد : طبقات جلد سوم ص ۲۹۳، ابو یوسف : کتاب الخراج ص ۱۰۶ -

★★★★